کریں گے وہی نقصان اٹھانے والے ہیں[۴]۔ اے بنی اسرائیل میرے انعام یاد کرو جو میں نے تم پر کئے اور دنیا جہان والوں پر فضیلت دی اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص کسی کے کام نہ آئے گا اور نہ اس سے کوئی بدلہ قبول کیا جائے گا۔ اور نہ اس کو کوئی سفارش فائدہ پہنچائے گی اور نہ وہ مدد دیئے جائیں گے[۵]۔

۱؎ یہ فرقہ اور گروہ کے ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو ہر ایک کو اپنی ہی خواہش کے مطابق چلانا چاہتے اور ہر ایک کو اپنے ہی فرقہ اور گروہ میں داخل کرنا چاہتے ہیں باہر کی کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے حق اور سچائی کی بات قبول کرنے کی توقع نہیں ہوتی ہے۔

۲؎ اللہ کی ہدایت تو بس ایک ہی ہے جو ہمیشہ ایک رہی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس کے ماننے والے بدلتے رہے ہیں یہ ہدایت تمہارے پاس بھی آئی تھی لیکن تم نے اس کو باقی نہیں رکھا۔ اس بناء پر اب یہ دوسروں کے حوالہ کی گئی ہے۔

۳؎ یہ بات کسی اندیشہ کی بناء پر نہیں کہی جارہی ہے کہ خدانخواستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کی خواہش کی پیروی کا اندیشہ تھا بلکہ ایک بات فرض کرکے اس کے برے انجام سے آگاہ کیا جارہا ہے جس سے یہ دکھانا اور بتانا مقصود ہے کہ رسول جیسی عظیم شخصیت بھی اگر ایسا کرے گی تو یہ بات اتنی بری ہے کہ رسول کی عظمت بھی برے انجام سے اس کو نہ بچا سکے گی۔ اور اس کو اپنے کام میں کوئی مددگار اور حمایتی نہ مل سکے گا

۴؎ یہ فرقہ اور گروہ کے ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو نیک دل اور سچے ہوتے ہیں۔ اللہ کی کتاب میں سے جو کچھ اور جس حالت میں ان کے پاس ہوتا ہے اس کو سینہ سے لگائے رہتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے ہی کام کے اور قابلِ قدر ہوتے ہیں۔ ان کی طرف توجہ کرنے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں سے حق بات قبول کرنے اور اس پر ایمان لانے کی توقع ہوتی ہے۔

۵؎ اوپر بہت دور سے بنی اسرائیل کی احسان فراموشی اور گمراہیوں کا تذکرہ اور اس پر تبصرہ

چلا آرہا ہے جس سے یہ ثابت کر دیا گیا کہ اب نہ دینی قیادت و سرداری کے لائق رہ گئے ہیں اور نہ اس انعام و فضیلت کے مستحق رہ گئے ہیں جو اس راہ سے ان کو حاصل تھی ۔

یہ آخر میں نعمتوں کی یاد دہانی پھر کرائی جارہی ہے ۔ پہلے بطور "تمہید" یاد دہانی کرائی گئی تھی (ملاحظہ ہو آیت ۴۷) اب حجت تمام کر دینے کے بعد بطور اظہارِ افسوس یاد دہانی کرائی جارہی ہے کہ میں نے تو تمہارے ساتھ سب کچھ کیا لیکن تم نے خود کو اس قابل ہی نہ رکھا (جیسا کہ اوپر بیان کئے ہوئے تذکرہ و تبصرہ سے ثابت ہو چکا ہے) اب میرے لئے دینی قیادت و سرداری کی تبدیلی کے بغیر چارہ نہیں رہ گیا ہے ۔

یہ تذکرہ و تبصرہ بنی اسرائیل کی صرف گزری ہوئی باتیں نہیں ہیں بلکہ قوموں کے زوال و ان کی گراوٹ و پستی کی "داستان" ہے جس میں ہر قوم کے لئے رہنمائی ہے خاص طور سے مسلمانوں کو اس سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیئے کہ بنی اسرائیل کے بعد انہیں کو دینی قیادت و سرداری کے لئے منتخب کیا گیا تھا اب وہ اس سے کتنے دور ہو گئے ہیں اور ان میں کس کس طرح وہی باتیں سرایت کر گئی ہیں جو بنی اسرائیل کی محرومی کا سبب بنی تھیں ۔

(جاری ہے)

بقیہ: تبصرۂ کتب

عشیر ان کو میسر نہ آیا جو اس کے درپے رہے ۔ یہ کتاب اس دعوی کی سب سے بڑی دلیل ہے ۔ آپ دیکھیں گے کہ اپنے وقت کے کتنے بڑے لوگ اختلاف فکر و نظر کے باوجود ابوالکلام کی بارگاہ میں کس طرح خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے حوالہ سے پاکستانی ابوالکلامیوں ہی نہیں ہر ذوقِ سلیم رکھنے والے انسان کے لیے یہ کتاب عظیم تحفہ ہے جس کی ظاہری خوبیاں بھی باطنی خوبیوں کی طرح اپنی مثال آپ ہیں ۔ اس گراں قدر کاوش پر المحمود اکادمی کے ارباب حل و عقد مبارک باد کے مستحق ہیں ۔

زیرِ تالیف کتاب

"لغات و اعرابِ قرآن"

کا

مقدّمہ

پروفیسر حافظ احمد یار

الحمد للّٰہ وحدہ- والصّلوٰۃ والسّلام علی عبدہ و رسولہ سیدنا محمد النّبی الامّیّ الذی لا نبیّ بعدہ- و علی اٰلہ و اصحابہ ومن دعا بدعوتہ و تمسّک بسنّتہ الی یوم الدّین

قرآن کریم کی عظمت و فضیلت اور اس کی اہمیت کسی تعریف یا تعارف کی محتاج نہیں۔

مسلمانوں کے لئے..... قرآن عظیم کی فضیلت کا مقام یہ ہے کہ وہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ خدائے ذوالجلال والاکرام کا وہ ابدی کلام اور سرمدی پیغام ہے جو خیرالانام محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت کی روشن دلیل اور معروف ترین معجزہ ہے..... اور یہ ربّ العالمین، احکم الحاکمین اللہ عزّوجلّ کی طرف سے خاتم النّبیّین رحمۃٌ للعالمین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ روح الامین نازل کردہ وہ کتاب مبین ہے جو ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ہے..... جو برہان و نور ہے اور جو حبل اللہ المتین ہے.....

اور غیر مسلموں کے لئے..... اس کی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کی انقلاب آفرینی اور اس کی کایا پلٹ "کیمیاگری" ان کے نزدیک بھی مسلّمہ ہے۔ یہی وہ کتابِ ہدایت ہے جس نے عربوں کو گمنامی اور گمراہی کے گڑھے سے نکال کر شہرت و حکومت اور رفعت و عظمت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

قرآن کریم کی اس عظمت اور اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

غیر مسلم اپنی اغراض کے لئے اپنے آپ کو مطالعۂ قرآن پر مجبور پاتے ہیں۔ مسلمانوں کی سربلندی کے اصل "قرآنی راز" سے آگاہی حاصل کرنے پر ہی وہ مسلمانوں کو اس "نسخۂ کیمیا" سے غافل کر کے دوبارہ قعرِ مذلت میں گرانے کا کوئی مؤثر پروگرام بنا سکتے ہیں۔ یہ قرآنی تعلیمات کی انقلابی اہمیت اور نفوسِ انسانی میں اس کی تاثیر کا خوف ہی تو تھا جس کی بنا پر کفارِ مکہ نے قرآن کریم کے بارے میں "..... وَ الْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ" (حٰمٓ السجدۃ۔ ۲۶) کی وہ پالیسی اپنائی تھی جس میں آج بھی اسلام کے دشمنوں کو اپنے مذموم عزائم کے لئے امیدِ موہوم کی کچھ کرن دکھائی دیتی ہے۔

مسلمانوں پر تو قرآن حکیم پر ایمان لانے کے ساتھ ہی اس کے حقوق اربعہ..... تعلّم، تدبّر، تعمیل اور تبلیغ..... کی ادائیگی واجب ہو جاتی ہے۔

ان میں سے پہلا حق "تعلّمِ قرآن" یعنی اسے سیکھنے کا ہے جس میں قرأت اور تلاوت کے ساتھ اس کے معانی کا علم اور اس کے احکام کا فہم بھی شامل ہے..... اور اس کی روزانہ تلاوت یا قرأت سے نہ صرف ادائے حقوقِ قرآن کی ابتداء ہوتی ہے، بلکہ بافہم تلاوت تو قرآن کریم کے باقی تمام حقوق ادا کرنے کے لئے پیہم یاددہانی کا کام بھی دیتی ہے۔

تعلیم و تعلّم قرآن کے اسباب و ذرائع اور اس کے لئے مطلوب علوم و فنون متعدّد اور متنوّع ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ فہم اور تدبّر کے ساتھ مطالعۂ قرآن کا انحصار کئی امور بلکہ علوم پر ہے۔ تاہم بلا اختلافِ احد..... یہ امر مسلّم ہے کہ اس سمت میں پہلا قدم عربی زبان کا..... کسی درجۂ مہارت تک کا..... معقول فہم ہے۔

اور اگر عربی زبان کا یہ علم و فہم ماہرانہ اور "متخصصانہ" درجے میں ممکن نہ ہو تو بھی کم از کم عامیانہ اور "مبتدیانہ" سطح سے خاصا اونچا ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ صرف قرآن کریم ہی نہیں تمام علوم اسلامیہ کی اصل اور بنیادی کتابیں عربی زبان ہی میں ہیں۔

اور یہاں عربی زبان سے ہماری مراد بھی قرآن و حدیث والی زبان ہے جسے اصطلاحاً "العربیۃ الفصحٰی" کہتے ہیں..... اور یہی زبان دنیا بھر کے مسلمانوں کی مشترکہ دینی اور ثقافتی زبان ہے۔ عربی زبان کی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد تو دین فہمی ہی ہے۔ اگرچہ آج کل عربی سیکھنے کی ضرورت کئی اور پہلوؤں سے بھی محسوس ہونے لگی ہے..... تاہم عرب ممالک میں بولی جانے والی عام روزمرہ کی (COLLOQUIAL) زبان جسے اصطلاحاً "اللغۃ

الدّارجۃ" کہتے ہیں..... اس کا سیکھنا سیاحوں اور عرب ممالک میں کام کرنے والے چھوٹے یا بڑے ملازموں یا دکانداروں وغیرہ کے لئے چاہے کتنا ہی ضروری یا مفید ہو..... قرآن فہمی تو کجا قرآن کی درست قرأت سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

عربی (یا کسی بھی زبان) کو سیکھنے کے لئے جدید ترین نظریۂ تعلیم کے مطابق..... چار مہارتوں کو بنیادی ضرورت سمجھا جاتا ہے..... استماع، نطق، قرأت اور کتابت (یعنی سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا) قرآن فہمی کے لئے عربی سیکھنے میں بھی یہ مہاراتِ اربعہ ناگزیر ہیں۔

اس کا سب سے پہلا مرحلہ ناظرہ قرآن خوانی سے شروع ہوتا ہے۔ عربی حروف کے درست مخارج اور ان کی اصوات (آوازوں) کو استماع اور نطق یعنی سن کر بولنے سے ہی سیکھا جا سکتا ہے۔ بعد کے مراحل میں یہ استماع و نطق عربی بول چال بذریعہ حوار و مکالمہ سیکھنے کے لئے بھی استعمال ہو سکتے ہیں اور ہونا چاہئیں..... تاہم عربی زبان سیکھنے کی خشتِ اوّل صحیح مخارج اور درست تلفظ کے ساتھ، قرآن خوانی کو قرار دینا اتنا اہم کام ہے کہ مشہور مصری عالم دکتور شوقی ضیف (جن کا تخصّص ہی عربی گرامر یعنی صرف و نحو ہے) نے اپنی کتاب "تجدید النحو" کے ابتدائی دس صفحات (ص ۴۹ تا ۵۸) میں کلمہ کی اقسام ثلاثہ (اسم، فعل، حرف) بیان کرنے کے فوراً بعد درست قرآن خوانی اور تجوید کے بنیادی قواعد مثل مخارج، اصواتِ حروف، حرکات، تشدید، تنوین، لین، مدّ، تفخیم، ترقیق، ہمزہ قطع و وصل، حروف شمسی و قمری اور ادغام و ابدال پر مفصّل بات کی ہے۔ (یعنی یہ تمام امور "قرآنی قاعدہ" میں آجانے چاہئیں)..... اور انہوں نے نطق سلیم اور تلفظ کی صحت کو عربی صرف و نحو کی تعلیم کے لئے بنیادی لازمی شرط (PRE-REQUISITE) قرار دیا ہے۔ بلکہ اس چیز سے غفلت کی بنا پر ہی مصریوں کی نئی (نوجوان) نسل کا لغۃ فصحی میں گنتگو کی صورت میں کلمات کے ناقص تلفظ اور حروف کے نطق میں لاابالی پن پر اظہار افسوس کیا ہے۔

صحیح مخارج، درست تلفظ اور عربی حروف کی صوتی خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے رواں اور شستہ لہجے میں ناظرہ قرآن خوانی سے تعلیمِ زبان کی تیسری مطلوبہ مہارت یعنی قرأت..... بلکہ بسرعت قرأت (RAPID READING) کے حصول کا وہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے جو نہ صرف تعلیمِ زبان (عربی) کی اہم اساس ہے۔ بلکہ اس کے ذریعے اس سے اگلے مراحل طے

کرنے کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ اس وقت اگر تیسری مہارتِ زبان (قرأت) کے ساتھ ہی بچے کے لئے زبان کی چوتھی مہارت (کتابت) کے حصول کی بنیاد رکھ دی جائے..... یعنی متعلّم کو عربی حروف (بخط نسخ) بقدرِ امکان خوشخط لکھوانے کا کام شروع کر دیا جائے..... بلکہ اگر افریقی مسلم ممالک میں رائج طریقے کے مطابق متعلّم کو (چھوٹی عمر میں ہی) سبق میں پڑھی جانے والی قرآنی عبارات یا کلمات کو..... کاغذ یا تختی پر..... ہو بہو نقل نویسی کی عادت ڈالی اور مشق کرائی جائے..... تو یہ چیز عربی زبان کی مؤثر اور بسرعت و سہولت تعلیم کی مضبوط اور مستحکم بنیاد ثابت ہو سکتی ہے۔

اور اگر کسی آدمی کو ابتدائی عمر میں ان مہاراتِ اربعہ کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے کا موقع نہیں ملا..... اور اب وہ عربی زبان کے سیکھنے کا بھی خواہاں ہے تو اسے حسبِ ضرورت پہلے چند دن یا چند ہفتے مخارج کی صحت، اور تلفظ کی درستی کے ساتھ قرآن کریم..... بلکہ عام مشکول عربی عبارات..... کی رواں قرأت (RAPID READING) کی مشق کر لینی چاہئے۔ اور اس کے ساتھ ہی عربی عبارات کو قرآنی اسلوبِ کتابت (خط نسخ) کے مطابق نقل کرنے یا لکھنے کی بھی کوشش کرنی چاہئے۔

مندرجہ بالا امور عربی زبان کی تعلیم کے لئے "مالابدّ منہ" کی حیثیت رکھتے ہیں اس کے بعد عربی صرف ونحو کے قواعد کی تدریس اور ترجمتین کے ذریعے ان کی عملی مشق کا درجہ آتا ہے۔ اور یہاں بھی عربی کی کسی اچھی مشکول درسی کتاب (READER) کا مطالعہ (قرأت و معانی) تعلیمِ قواعد سے پہلے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ جاری رکھنا چاہئے۔ تجربہ شاہد ہے کہ اگر اسی تدریس کو دو ڈھائی گھنٹے روزانہ (مع مشقی کام HOME-WORK) دیئے جائیں تو طالب علم کی سابقہ تعلیمی استعداد (بی اے۔ ایف اے یا میٹرک ہونے) کے لحاظ سے ایک یا دو سال کے عرصے میں نہ صرف عربی زبان کا اچھا خاصہ ذخیرۂ الفاظ (VOCABULARY) بلکہ وہ تمام ضروری قواعد زبان..... صرف و نحو..... ذہن نشین کرائے جا سکتے ہیں..... جو ترجمۂ قرآن کی لغوی اور نحوی بنیادوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیں اور جن کا بطور سلیبس یا مقدارِ نصاب کے ہم ابھی آگے چل کر ذکر کریں گے۔

اس سے اگلے مراحل (اگر کوئی طے کرنا چاہے تو) میں عربی نظم و نثر کی کتابیں پڑھ کر ذوقِ ادب پیدا کرنے، اسالیبِ کلام سے آشنا ہونے کے بعد آخر پر درجہ تخصّص میں بلاغت اور

معانی و بیان کے اصولوں سے آگاہ ہونے اور ان کے عملی اطلاق کے مراحل طے کرنے سے عربی زبان وادب پر عبور اور اس میں مہارت کا علمی درجہ تکمیل پذیر ہوتا ہے..... تاہم یہ آخری مراحل قرآن فہمی کے بنیادی لوازمات نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کو تدبّر کے ساتھ فہم قرآن کی "تحسینیات" اور "مستحبّات" میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

تخصّص زبان کے اس آخری درجہ سے پہلے قواعد صرف و نحو کے ایک معقول اور معیاری نصاب (جن کا ذکر آگے آئے گا) کی کامیاب تکمیل کے بعد قرآن کریم کو..... ترجمہ کی حد تک..... براہ راست سمجھنے کے کام کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ طالب علم اس مرحلے پر فہم قرآن کے دو بنیادی عناصر..... لغات (مادہ و اشتقاق کی بحث) اور وجوہ اعراب کی بنیاد سے آگاہ ہو چکا ہوتا ہے وہ کلمات کی بنائی اور اعرابی حرکات کے تغیّرات کے اسباب و نتائج کو جاننے لگتا ہے اور معجم (ڈکشنری) کے استعمال پر قادر ہونے کی بناء پر وہ کلمات کے لُغوی معنی کی بحث کو سمجھ سکتا ہے۔ بلکہ عبارت کے اندر کلمات کے باہمی تعلق (ترکیب) کی بناء پر عبارت کے معنی متعیّن کرنے پر قادر ہو سکتا ہے۔ گویا وہ براہ راست فہم قرآن کی دہلیز پر آ کھڑا ہوتا ہے۔

اس "لغاتِ قرآن" اور "اعرابِ قرآن" کا فہم قرآن سے کتنا گہرا تعلق ہے اس کا اندازہ اس بات سے کر لیجئے کہ عموماً ہر قابل ذکر مفسّر اپنی کتاب (تفسیر) میں تفسیر آیات (مثلاً بعض واقعات یا احکام کی تفصیل یا کسی نکتہ آفرینی وغیرہ) سے پہلے نصِّ قرآنی (عبارت) کے مفرد کلمات (الفاظ) کی لغوی تشریح اور مرکب کلمات (جملوں) میں کم از کم بعض اہم اعراب کی توضیح ضروری سمجھتا ہے..... اور بعض تفاسیر (مثلاً کشّاف، بیضاوی وغیرہ) اپنی اس خصوصیت کی بنا پر ہی اہل علم کے ہاں زیادہ مقبول ہوئی ہیں۔

خیال رہے کہ عربی دنیا کی واحد زندہ اور ترقی یافتہ زبان ہے جس میں کلمات (خصوصاً اسماء و افعال) کی بنیاد (عموماً) ایک سہ حرفی مادہ ہوتا ہے..... اگرچہ بعض دوسری سامی زبانوں مثلاً عبرانی، سریانی، آرامی، امہری، حبشی وغیرہ میں بھی یہ "مادۂ کلمات" والی بات پائی جاتی ہے لیکن ان میں سے اکثر یا تو اب مردہ زبانیں شمار ہوتی ہیں۔ یا ان زبانوں کے مقابلے پر عربی میں یہ چیز زیادہ وسیع اور ایسی ترقی یافتہ صورت میں پائی جاتی ہے کہ ایک ایک مادہ سے نکلنے والے

مشتق اور جامد کلمات میں سے معانی و مفاہیم کے اتنے چشمے پھوٹتے ہیں جنہوں نے عربی زبان کو ایک دریائے ناپیدا کنار بنا دیا ہے۔

عربی زبان اپنی ترقی کے یہ مدارج طے کر کے ظہور اسلام اور نزول قرآن سے پہلے (خصوصاً حجاز میں) اپنے بلوغ کو پہنچ چکی تھی۔ قرآن اور اسلام کی بدولت اسی عربی زبان کو حیاتِ دوام حاصل ہوئی۔ اور یہی زبان آج تک دنیائے اسلام کی مشترک دینی اور ثقافتی زبان ہے۔

دوسری طرف عربی دنیا کی ان چند زبانوں میں سے ایک ہے جن میں اسماء و افعال کے آخری حصے میں تصریف سے بعض قواعد و ضوابط کے ساتھ ایک تبدیلی (INFLECTION) واقع ہوتی ہے۔ جسے اعرابی تبدیلی یا اعرابی حالتیں یا صرف "اعراب" کہتے ہیں۔ یہ خصوصیت بھی دنیا کی بعض قدیم زبانوں مثلاً یونانی، لاطینی وغیرہ میں بھی موجود تھی۔ مگر آج کی زندہ زبانوں میں سے یہ چیز صرف تین زبانوں..... عربی، جرمن اور امہری (حبشی)..... میں پائی جاتی ہے..... اور عربی میں بھی یہ چیز قرآن کریم کی برکت سے صرف لغۃِ فصحٰی یعنی علمی عربی میں پائی جاتی ہے ورنہ روزمرہ کی بول چال... لغۃ دارجہ..... میں تو عرب بھی اسے خیرباد کہہ چکے ہیں۔

فہم قرآن کی کسی بھی علمی کوشش میں عربی زبان کی ان دو خصوصیات یعنی لغوی اور نحوی پہلوؤں..... لغات اور اعراب..... کو مدِّنظر رکھے بغیر چارہ نہیں۔ تفسیر کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ نصّ قرآنی (عبارت) کی تفسیر و توضیح کے کام کا آغاز ان دو امور سے ہی کیا جاسکتا ہے اور کیا جاتا ہے۔

بلکہ "لغات و اعرابِ قرآن" کی اسی اہمیت کے پیش نظر ان موضوعات پر مستقل تالیفات موجود ہیں جو خصوصاً ان دو موضوعات سے متعلق مشکل (غریب) کلمات یعنی غریب المفردات اور مشکل مرکبات یعنی غریب الاعراب سے بحث کرتی ہیں۔ مثلاً حسین بن محمد المعروف راغب اصفہانی (المتوفی ۵۰۲ھ) کی المفردات فی غریب القرآن اور (عبدالرحمٰن بن محمد المعروف ابن الانباری (المتوفی ۵۷۷ھ) کی البیان فی غریب اعراب القرآن..... اور یہ تو ہم نے صرف دو کتابوں کا نام لیا ہے ورنہ ان..... دو موضوعات..... میں سے ہر ایک موضوع پر بلکہ بعض دفعہ ان کے ضمنی موضوعات پر مستقل تالیفات میں یا بعض بڑی کتابوں کے مختص ابواب میں بحث کی گئی ہے۔ جن کا مختصر تعارف بھی ایک مستقل مقالے کا محتاج ہے۔ صرف ابن الندیم نے الفہرست میں اس قسم کی

ایسی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ یہ دو امور (لغات اور اعراب قرآن) اگرچہ فہم قرآن یا ترجمۂ قرآن کی بنیاد ہیں۔ تاہم یہی اور محض یہی فیصلہ کن عامل نہیں ہیں۔ اس لئے کہ فہمِ قرآن کے دوسرے عوامل و ذرائع خصوصاً سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، تفسیرِ ماثور، سیرتِ طیبہ اور تاریخِ عرب وغیرہ سے بھی استفادہ ناگزیر ہے۔ اور پھر لغوی مباحث میں بھی عام و خاص، حقیقت و مجاز، صریح و کنایہ اور تشبیہ و استعارہ وغیرہ کے قواعد استعمال کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ اور سب سے بڑھ کر تو اس معاملے میں ایمان (عقیدہ کی درستی)، تقویٰ، خدا خوفی، دیانتداری اور اخلاصِ نیّت کا دخل ہے۔ ورنہ کسی عبارت کو من مانے معنی "پہنانا" یا کسی مجموعۂ عبارات میں سے اپنی مرضی کے موافق عبارت اور کلمات نکال دکھانا۔ یہ تو حضرتِ انسان کی وہ خصوصیت ہے جس کے مظاہر صرف "خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں" کی قسم کے نام نہاد مذہبی رہنماؤں کی تحریر و تقریر میں ہی نہیں بلکہ ہماری عدالتی کارروائیوں میں وکلاء کے باہم متصادم دلائل میں اور سیاسی لیڈروں کے مناظرانہ بیانات میں مشاہدہ کر سکتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔ (وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ..... (الکہف - ۵۴)

اس جملہ معترضہ کے باوجود اس میں شک نہیں کہ لغات و اعراب قرآن کے علم کے بغیر قرآن کریم سے براہِ راست علمی یا فکری رابطہ ممکن نہیں۔ اس رابطہ کے بعد قرآن کریم سے ہدایت و رہنمائی پانا ..... یا قرآن کے ذریعے ہی اپنی گمراہی کو مستحکم کرنا ..... یہ تو "نصیب اپنا اپنا" والی بات ہے اور اس نصیب کا تعیّن کرنے والے اندرونی بیرونی عوامل کی بحث ایک الگ مسئلہ ہے۔

جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر بیان کیا ہے اس موضوع کی اہمیت کی بناء پر عربی زبان میں تو لغاتِ قرآن اور اعرابِ قرآن پر متعدّد اعلیٰ پایہ کی تالیفات موجود ہیں۔ تاہم اردو زبان میں ابھی اس چیز کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ اور لغات القرآن پر تو پھر بھی اردو میں اچھا خاصا کام ہو چکا ہے۔ اگرچہ ان میں سے بعض میں صرف اپنی اغراض کے لئے کام دینے والے الفاظ و معانی جمع کر کے اپنے لئے لغات القرآن کے نام پر ایک خود ساختہ سند مہیا کرنے کی کوشش ہی کی گئی